R. No. 2186/57

REGD. NO. L 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت
۲۲ - ۱۵ - ۸ - ۱

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی پندرہ پیسے

جلد ۲۷ ۔ شمارہ ۲۸	ایڈیٹر: آل احمد سرور	۲۲ جولائی ۱۹۶۸ء

اداریہ

کیا اردو کا مسئلہ محض سیاسی ہے؟

آج کل کچھ لوگ بار بار یہ بات دہراتے ہیں کہ اردو کا مسئلہ لسانی نہیں رہا، سیاسی ہو گیا ہے اور اسے سیاسی سطح پر ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ بظاہر یہ رائے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک سستی اور سطحی رائے ہے۔ اس لئے ہم اس مسئلے پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

اردو ایک جدید ہندوستانی زبان ہے۔ یہ ہندوستان کی قومی زبانوں میں سے ہے۔ اس کے بولنے والے ڈھائی کروڑ سے کم نہیں بلکہ تین کروڑ کے قریب ہوں گے۔ یہ ہندوستان کی ہر ریاست میں بولی جاتی ہے۔ مگر اس کے بولنے والے کسی ریاست میں اکثریت میں نہیں ہیں۔ ہاں اترپردیش، بہار، آندھرا پردیش، میسور، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، راجستھان، مغربی بنگال میں ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ اس کا ایک شاندار ادب ہے۔ اس زبان کے بولنے والوں میں سبھی مذاہب کے لوگ مل جائیں گے گو مسلمانوں کی تعداد یقیناً غالب تعداد ہے مگر چونکہ مسلمان بھی ہندوستانی قوم کا ایک جز ہیں، اس لئے اس بات سے اردو کی قومی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے اردو کو وہ سہولتیں نہیں ملتیں جن کی وہ ایک قومی زبان کی حیثیت سے مستحق ہے۔ اس کی تعلیم ناقص، ناکافی اور غیر تسلی بخش ہے۔ اس کے چلن پر پابندیاں ہیں۔ اس کے اخباروں اور رسالوں کے خریدار کم ہیں۔ اس کی کتابوں کی نکاسی بہت کم ہوتی ہے اس کے ادیبوں اور شاعروں کی وہ ہمت افزائی نہیں ہوتی جس کے وہ مستحق ہیں۔ ان سب باتوں کے لئے اردو والے عام طور پر حکومت اور اکثریت کو الزام دیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اردو کے معاملے میں حکومت اور اکثریت نے اپنا فرض انجام نہیں دیا۔ حکومت جمہوریت کے آئین کے مطابق چلنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ دستور سب کو برابر کے حقوق دیتا ہے۔ سیکولرزم ہمارا مسلک ہے اور سوشلزم کی منزل ہماری منزل مقصود۔ اس لئے حکومت پر لازم آتا ہے کہ جو کہتی ہے وہ کرے، جو دعویٰ ہے اس کے مطابق عمل ہو۔ جو ہدایات اور اعلانات ہیں ان کی پابندی ہو۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ حکومت خود جمہوریت کے اصولوں کو پامال کرتی ہے۔ اکثریت اقلیت کے حقوق کو نظر انداز کرتی ہے۔ اس لیے حکومت مورد الزام ہے، اکثریت تنگ نظر ہے۔ ظاہر ہے ان حالات میں اردو کی ترقی کیسے ہو۔ ہماری سیاست گمراہ ہے۔ اس گمراہ سیاست نے اردو کی حق تلفی کی ہے۔ یعنی جو پارٹیاں برسر اقتدار رہی ہیں انھوں نے اردو کی ترقی نہیں ہونے دی۔ اس لئے اگر ان کی جگہ دیگر پارٹیاں لے لیں جو اردو کے معاملے میں زیادہ انصاف پسند معلوم ہوتی ہیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اردو کے دن پھر جائیں گے۔ اردو دوستوں کو چاہئے کہ ایسی پارٹیوں کو اقتدار دلائیں جو اردو کے ساتھ انصاف کریں گی۔ اردو کی تحریک کو اس لیے عوامی بنانا چاہئے کہ وہ احتجاجی ہو اور اس کا احتجاج سیاسی پارٹیاں محسوس کریں اور پھر اردو کے ساتھ انصاف بھی چناؤ میں ایک مسئلہ ہو۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اردو دوستوں کو سیاسی پارٹیوں کی حمایت حاصل نہیں کرنی چاہئے۔ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ اردو کے حقوق کو منوانے کے لئے حکومت یا اکثریت یا عوام کو اپنے احساس سے باخبر نہیں رکھنا چاہئے۔ ہمیں جو حقوق جمہوریت نے دئے ہیں وہ سب استعمال کرنے چاہئیں مگر ہمیں تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ یہ مسئلہ کا ایک پہلو ہے اور ہماری رائے میں بنیادی اہمیت نہیں رکھتا۔ بنیادی اہمیت اس چیز کی ہے کہ اردو دوستوں کو اپنی زبان کس حد تک پیاری ہے اور وہ اس کے لئے عملی طور پر کیا کرتے ہیں۔ اردو کے لئے جان دینے کی ضرورت نہیں اردو کے لئے زندہ رہنے کی ضرورت ہے۔ اردو کے حقوق نہ ملنے پر حکومت یا اکثریت کو الزام دینے سے یا ناسازگار حالات کا ماتم کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ آج کی دنیا میں ہر شخص خود غرض ہے سب اپنے کام سے واسطہ ہے۔ انصاف ایک اخلاقی قدر ہے اور آج کے کاروباری دور میں انصاف کا نام تو اس لئے لیا جاتا ہے کہ اخلاق کا

تام کے بغیر کوئی بات مکمل نہیں ہوتی مگر انصاف کی پروا کم لوگوں کو ہے۔ ہر فرد اور جماعت کو خود وہ کام کرنا ہے جسے وہ ضروری سمجھتی ہے۔ اردو دوست اگر اردو کو عزیز رکھتے ہیں تو انھیں یا تو اپنے بچوں کو عام اردو اسکولوں میں پڑھانا ہوگا یا اگر اردو اسکول کا ریاست نے انتظام نہیں کیا ہے تو اپنے اسکول کھولنے ہوں گے اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو اپنے بچوں کو خود پڑھانا ہوگا یا ایسا انتظام کرنا ہوگا کہ جز وقتی معلم انھیں پڑھا سکیں۔ اگر ہم دس برس تک اور صرف حکومت اور اکثریت کی زیادتیاں گنتے رہے اور اردو پڑھانے کے لئے خود ہم نے کچھ نہیں کیا، تو اردو کا خدا ہی حافظ ہے۔ اگر ہم اردو کی کتابیں اور رسالے صرف تحفے میں پڑھتے رہے اور کتاب یا رسالہ یا اخبار خریدنا ہم نے اپنا فرض نہیں سمجھا تو یہ اخبار اور رسالے ترقی کیسے کریں گے۔ اگر ہم نے اپنے بچوں کو کم عمری میں اردو نہیں سکھائی، اپنے ادیبوں اور شاعروں سے واقف نہ کرایا تو آگے چل کر ان کا ہمارے ادب سے اور ہماری تہذیب سے تعلق کیا ہوگا اس لئے اردو کے لئے اصلی اور بنیادی کام ہمیں خود کرنا ہے۔ یہ اصلی اور بنیادی کام اردو کی تعلیم کا ہے اور وہ بھی ابتدائی تعلیم کا۔ ہم ایسے کتنے ہی لوگوں کو جانتے ہیں جو پلیٹ فارم پر اردو کے لئے تقریریں کرتے ہیں۔ حکومت کو سخت سست سناتے ہیں مگر اپنے بچوں کو انگریزی اسکولوں میں بھیجتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں کہ انھیں اردو نہیں آتی۔ اگر کوئی کام ضروری ہے تو اسے خود کرنا چاہئے۔ اس میں کوئی ریاست نہیں ہے جو حکومت فلاں فراہم نہیں کر سکی تیسری یہ کہ نہیں کرایا تو آپ نے روزگار کی کم نہیں کرایا ثقافت کے سلسلے کو نہیں لگ پاتی۔

برہم ناتھ دت

طبل

(۱) سنو! سنو! قدموں کی چاپ سنو!
ہتھیار بند بہادروں کی للکار سنو
دیکھو! دیکھو! قومی لشکر کی قطار بندی دیکھو!
طبل بہانگ دہل کہہ رہا ہے
"آؤ بہادرو آؤ!
جوہر مردانگی دکھاؤ!"

(۲) متذبذب دل نے کہا:-
"زندگی کا مقصد کشت و خون تو نہیں!
کھیتوں کو پانی کون دے گا؟
فصلیں کون کاٹے گا؟"
مگر طبل کی پکار تھی:
"آؤ! بہادرو آؤ!
تیغ کے جوہر دکھاؤ
خون سے آبیاری کرو"

(۳) مضطرب دل نے کہا:-
"جنگ جیت بھی لی تو کیا حاصل؟
دشمن پچھاڑ بھی لیا تو شر کا کیا علاج؟!!"
مگر طبل کی پکار تھی:-
"آؤ بہادرو آؤ!
تمہیں اجداد کی قسم!
تمہیں یہ کام کرنا ہی ہوگا"

(۴) مغموم دل نے کہا:-
"توپوں کی مار، بموں گولیوں کی بوچھار
جب انجنوں کو فنا کر دے گی تو چین کہاں؟
بیواؤں کی سینہ کوبی، یتیموں کی بکا
یہ ہولناک منظر کس سے دیکھا جائے؟"
مگر طبل کی پکار تھی:-
"آؤ! بہادرو آؤ!
جیالے کی موت پست ہمتی کی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے"

(۵) بعض تذبذب میں تھے، بعض امید و بیم میں
بعض اعتماد سے بڑھے، بعض نیم دلی سے
مگر جب طبل پر چوٹ پڑی اور یہ پکار اٹھی
"آؤ! آؤ! وطن کے سپوتو آؤ!"
تو طرفہ تماشہ یہ ہوا کہ طبل خاموش ہو گیا
اور سب یک زبان بول اٹھے
"لو! ہم آئے! لو! ہم آئے"

جن کی عملی صلاحیت اتنی کم ہے وہ اردو کو سرکاری زبان تسلیم کر لے تب بھی یہ بات کاغذ پر ہی رہے گی۔ ہاں اردو والے خود اپنے بچوں کو اردو بہرحال پڑھائیں گے تو پھر اردو کے تمام حقوق بھی حاصل کر لیں گے۔ آج کی سیاست اقتدار کے لئے ہے اردو کا مسئلہ خدمت کا مسئلہ ہے اردو کو اقتدار نہیں چاہئے ٹھوس اور پرخلوص خدمت چاہئے۔

نیپال نے اردو کو نصاب میں شامل کر لیا

کھٹمنڈو: نیپال نے اردو کو نصاب تعلیم میں شامل کر لیا ہے۔ میٹرک یعنی کے نصاب میں اردو کی جو کتاب رکھی گئی ہے اس کا نام "انتخاب نثر و بوستان نظم" ہے، اس کتاب کے مولف ایس۔ ایس۔ اصلاحی ہیں اس کی اشاعت ہندوستان میں ہوئی ہے۔ (قومی آواز)

برطانیہ میں اردو اور ہندی میں پوسٹر

برمنگھم: تفریحوں اور تماشوں کا اہتمام کرنے والی ایک جماعت یہاں رہنے والے ہندوستانی اور پاکستانی عوام کے لئے ہندی، اردو اور بنگالی میں پوسٹر چھاپ رہی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ مقامی حالات سے ان کو دلچسپی پیدا ہو۔ یہ پوسٹر جناب پرمانند شرما نے تیار کئے ہیں جو ایک مقامی مجسٹریٹ کی معاونت میں مترجم ہیں۔ انھیں اس لئے یہ کام سونپا گیا کہ ہندوستانی اور پاکستانی ان تفریحوں اور تماشوں میں شرکت کریں اور کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کریں۔ (سیاست)

احمد لاری

بیگم حسرت موہانی

مولانا حسرت موہانی نے ایک موقع پر کہا تھا کہ اگر بیگم حسرت، بیگم ابوالکلام آزاد اور کملا نہرو نہ ہوتیں تو حسرت کسی اخبار کے ایڈیٹر ہوتے ابوالکلام آزاد "الہلال" اور "البلاغ" نکالتے رہتے اور جواہر لال نہرو زیادہ سے زیادہ ایک کامیاب بیرسٹر ہوتے۔ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے یہ تینوں عورتیں پیکر ایثار و قربانی تھیں اور انھوں نے زندگی کے ہر مرحلے میں اپنے خاوندوں کی مکمل رفاقت کی۔ میں اس صحبت میں بیگم حسرت موہانی کا مختصر تعارف کرانا چاہتا ہوں۔

عبد الشکور صاحب نے اپنی تالیف "حسرت موہانی" میں رسالہ "رہبر نسواں" کے نومبر ۱۹۲۳ء کے شمارے سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جس سے بیگم حسرت کی ابتدائی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ اقتباس ذیل میں درج ہے:

"محترمہ نشاط النسا بیگم غالباً ۱۸۸۵ء میں موہان ضلع اناؤ (اودھ) میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد سید شبیر حسن موہانی مرحوم، جن کا حال میں انتقال ہوا ہے، رائچور (ریاست حیدرآباد) میں وکیل ہائیکورٹ تھے۔ چونکہ سادات موہان میں علم و کمال کا چرچا شروع سے رہا ہے اس لئے محترمہ نشاط بیگم قصبات اودھ کی عام لڑکیوں کی طرح زیور تعلیم سے محروم نہ رہ سکیں اور آپ کو مذہبی تعلیم کے علاوہ اردو فارسی اور عربی زبانوں کی معقول تعلیم دلائی گئی۔ زمانہ دوشیزگی میں آپ کا خاص مشغلہ یہ تھا کہ بیسیوں مانند قصبہ کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی تھیں۔ اور اگر آج موہان میں تعلیم نسواں کی جھلک نظر آتی ہے تو محترمہ نشاط بیگم کی کوشش اور مالی ایثار کا ثمرہ ہے۔"[۱]

نشاط النسا بیگم مولانا حسرت موہانی کے خاندان سے ہی تعلق رکھتی تھیں اور ان کی قریبی عزیز تھیں۔ نشاط النسا بیگم کے والد حسرت کے ماموں بھی تھے اور پھوپھا بھی۔ چونکہ اس خاندان میں آپس ہی میں شادی بیاہ کا رواج تھا، اس لئے نشاط النسا بیگم اور حسرت میں اور بھی قرابتیں تھیں، جن پر حسرت نے اپنے ایک مضمون میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔[۲]

نشاط النسا بیگم کی شادی حسرت کے ساتھ ۱۹۰۱ء میں ہوئی۔ شادی کے کچھ ہی دنوں بعد وہ علی گڑھ چلی گئیں اور ۱۹۱۰ء تک علی گڑھ میں قیام پذیر رہیں۔ حسرت نے جب ۱۹۲۰ء کے شروع میں کانپور کو اپنا مستقر بنایا تو ان کے ساتھ وہ بھی کانپور منتقل ہو گئیں وہ صحیح معنوں میں حسرت کی شریک حیات تھیں۔ حسرت کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس میں وہ پورے طور پر ان کی شریک کار نہ رہی ہوں۔ حسرت کے قید و بند کے ایام میں ان کے مقدمات کی پیروی، پریس کا بندوبست، تجارت کا انتظام، دواوین کی ترتیب و اشاعت الغرض ہر کام انھوں نے بحسن و خوبی انجام دئے۔

سیاسی کاموں میں بھی بیگم حسرت پورے طور پر حسرت کی رفیق کار تھیں۔ وہ کل ہند کانگرس کمیٹی کی مجلس عاملہ کی رکن تھیں اور حسرت کے ساتھ سیاسی جلسوں میں برابر شرکت کرتی تھیں۔[۲] ۱۹۲۵ء میں کانگرس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر انھوں نے حسرت کے ساتھ مزدوروں کے ایک جلوس کی قیادت کی تھی اور اس جلوس کے روکے جانے پر پنڈت جواہر لال نہرو کے منہ پر طمانچہ مارا تھا۔ اس واقعے کی تفصیل مولانا جمال میاں فرنگی محلی کے الفاظ میں سنیے:

"۱۹۲۵ء میں، کانگرس کا سالانہ اجلاس مسز نائیڈو کی صدارت میں کانپور میں ہو رہا تھا۔ مولانا حسرت اور بیگم حسرت مزدوروں کے ایک جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ جب کانگرس کے پنڈال کے قریب یہ جلوس پہنچا تو پنڈت جواہر لال نہرو نے جو کانگرس رضا کاروں کی کمان کر رہے تھے اس جلوس پر لاٹھی چارج کرنے کی دھمکی دی۔ اس پر مرحومہ بیگم حسرت موہانی نے بڑھ کر جواہر لال نہرو کے منہ پر طمانچہ لگایا اور نادری حکم کی بدتمیزی پر سرزنش کی۔ جواہر لال نہرو نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور یہ جلوس کانگرس کے اجلاس میں شامل ہو گیا۔"[۳]

حسرت کی طرح بیگم حسرت بھی مذہباً حنفی اور مشرباً قادری تھیں وہ نماز روزہ کی بچپن سے پابند تھیں۔ انھوں نے چار حج بھی کئے (۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۶ء)۔ انھیں حضرت غوث پاک سے بڑی عقیدت تھی اور وہ حسرت کے پیر و مرشد مولانا شاہ عبد الوہاب فرنگی محلی کی مرید بھی تھیں۔[۴]

بیگم حسرت کا ادبی ذوق بھی بہت بلند تھا۔ حسرت کے دواوین کی ترتیب و اشاعت کے علاوہ ان سے دو مختصر کتابیں "سفرنامہ حج"

---

۱ عبد الشکور، حسرت موہانی (اشاعت سوم)، ص ۱۱

۲ حسرت موہانی، مقالہ "بیگم حسرت موہانی" موشو عہ اردوئے معلیٰ، شمارہ اگست تا اکتوبر ۱۹۳۷ء ص ۲۔

۱ عبد الشکور، حسرت موہانی (اشاعت سوم)، ص ۱۸۲-۱۸۳

۲ جمال میاں فرنگی محلی، مقدمہ "کلیات حسرت موہانی" (اشاعت سوم)، ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ص ۲۷

۳ نعیمہ بیگم، حسرت گھر کی چہار دیواری میں، ص ۲۷

اور "سفر نامۂ عراق" بھی یادگار ہیں۔ یہ کتابچے در اصل خطوط کے مجموعے ہیں جو انھوں نے حج کے سفر کے دوران اپنی دختر نعیمہ بیگم کو لکھے تھے۔ "سفر نامۂ حجاز" میں ۱۹۳۵ء کے سفر حج کا بیان ہے۔ ۱۹۳۶ء میں حسرت اور بیگم حسرت نے خشکی کے راستے عراق ہو کر حج کا سفر کیا تھا۔ "سفر نامۂ عراق" اسی سفر کی روداد ہے۔[1]

بیگم حسرت نہایت شریف، وفادار، جری، مستقل مزاج اور خود دار عورت تھیں۔ حسرت کی پہلی گرفتاری (۲۳ جون ۱۹۰۸ء) کے بعد انھوں نے پردہ ترک کر دیا۔ لیکن وہ نہایت سادہ اور پردہ پوش لباس میں باہر نکلتی تھیں۔[2] حسرت کے ایام قید و بند میں انھوں نے جس جرأت، استقلال اور خود داری کا مظاہرہ کیا اس کی مثال ذرا مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ حسرت کی دوسری گرفتاری کے بعد پنڈت کشن پرشاد کول نے ایک موقع پر بیگم حسرت کو مالی امداد کی پیش کش کی تھی، مگر انھوں نے اسے قبول نہیں کیا۔[3] یہ واقعہ ان کی خودداری اور استقلال کی ایک روشن مثال ہے۔ حسرت نے اپنے ایک مضمون میں بیگم حسرت کی سیرت کا جو خاکہ پیش کیا ہے اسے انھیں کے الفاظ میں سنیے:

"خدا گواہ کہ راقم کے اس قول میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ ایثار و انکسار، حیا و غیرت، محبت و مروت، فہم و فراست، جرأت و صداقت، عزم و ہمت، وفا و سخا، حسن عقیدت، صدق نیت و خلوص عبادت، حسن خلق، صحت مذاق، پاکی و پاکیزگی، صبر و استقلال اور سب سے بڑھ کر عشق رسول اور محبت حضرت حق کے لحاظ سے شاید مسلمان عورتوں بلکہ مردوں میں بھی کم ایسے افراد موجود ہوں گے جن کو ہم بیگم حسرت سے بہتر تو کیا ان کے برابر بھی قرار دے سکیں گے"[4]

مولانا حسرت کے لیے تو بیگم حسرت کی سیرت کی بلندی اور کردار کی عظمت کا اعتراف کرنا فطری تھا۔ لیکن دوسرے معاصر مشاہیر جیسے مولانا محمد علی، مولانا ابو الکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، خواجہ حسن نظامی اور مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی بیگم حسرت کے جرأت و استقلال، عزم و ہمت اور وفا شعاری کی بڑی تعریف کی ہے۔ طوالت کے خیال سے میں یہاں مولانا محمد علی کے ایک مراسلے، خواجہ حسن نظامی کے ایک مضمون اور جواہر لال نہرو کے ایک پیغام سے اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

"مگر بھائی حسرت سے کہہ دیجیے کہ برادرم باوجود ہمت و استقلال کے تمہارا مرتبہ ہماری نظر میں ایک نحیف الجثہ عورت سے کم ہی رہے گا جس کے سینے میں بظاہر تم سے بھی بڑا دل موجود تھا اور جس نے تمہاری غیر حاضری میں مسلمانوں کو ہمت و استقلال، جرأت و حوصلہ کا وہ سبق دیا جو تم خود آزاد ہو کر نہ دے سکتے تھے اور جو شاید قید ہو کر بھی نہیں دیا۔"[5]

"حسرت کی بیوی مسلمانانِ ہند کی عورتوں میں بڑی وفادار اور شوہر پرست عورت ہے۔ ایام بلا میں ایسی وفا شعاری اس عورت سے ظاہر ہوئی جیسے سیتا جی نے رام چندر جی کی تھی۔"[6]

"مولانا کی بیوی ایک نہایت دلیر خاتون تھیں جن کی ہمت کی میں بہت تعریف کرتا ہوں۔"[7]

"ایک طویل عرصے تک بیمار رہنے کے بعد بیگم حسرت ۱۸ اپریل ۱۹۳۷ء (مطابق ۷ محرم ۱۳۵۶ھ) کو واصل بحق ہوئیں۔[8] ان سے ایک لڑکی نعیمہ بیگم یادگار ہیں جو اس وقت اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ کراچی میں مقیم ہیں۔ بیگم حسرت کی وفات کے بعد حسرت نے درد نہایت پر درد غزلیں کہی تھیں۔ جو ان کے دلی جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ ان غزلوں کے مطلعے ذیل میں درج ہیں:

وہ کیا خواب میں نہ آئے　　شرم انھیں ہو نہ روٹھ جانے کی

عاشقی کا حوصلہ بیکار ہے تیرے بغیر
آرزوئی زندگی دشوار ہے تیرے بغیر

---

[1] حسرت موہانی، مقدمہ "سفر نامۂ عراق" (مؤلفہ بیگم حسرت موہانی) ص ۲۔ ("سفر نامۂ حجاز" راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس کا ذکر حسرت نے "سفر نامۂ عراق" کے مقدمے میں کیا ہے)

[2] سید سلیمان ندوی، مقالہ "حسرت کی سیاسی زندگی"، موضوعہ "نگار" لکھنؤ (حسرت نمبر)، ص ۱۱۵

[3] پنڈت کشن پرشاد کول، مقالہ "حسرت موہانی کی شخصیت" موضوعہ "نگار" لکھنؤ (حسرت نمبر)، ص ۹۹

[4] حسرت موہانی، مقالہ "بیگم حسرت موہانی" موضوعہ "اردوئے معلی" شمارہ فروری تا اپریل ۱۹۳۷ء ص ۱۔

[5] مولانا محمد علی کا خط بیگم حسرت موہانی کے نام، از چھندواڑہ مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۱۸ء (اصل خط مولانا خیر بہوروی صاحب کے پاس محفوظ ہے)

[6] خواجہ حسن نظامی، مقالہ "شاہیر ہند" موضوعہ درویش جنتری ۱۹۲۳ء بحوالہ "کتابی دنیا" کراچی، شمارہ جنوری فروری ۱۹۷۶ء، ص ۲۹

[7] جواہر لال نہرو کا پیغام بنام حسرت میموریل سوسائٹی کانپور بحوالہ نعیمہ بیگم۔

حسرت قمر کی چار دیواری میں ص ص ۲۳ و ۲۴

[8] حسرت موہانی، مقالہ "بیگم حسرت موہانی"، موضوعہ "اردوئے معلی" شمارہ فروری تا اپریل ۱۹۳۷ء ص ۱۔

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

تحریک الدیوان

(مصر کی ایک ادبی تحریک)

عقاد اور مازنی نے دس جلدوں میں ایک کتاب "الدیوان" کے نام سے شائع کرنے کا اعلان کیا۔ اسی وجہ سے اس ادبی تحریک کا نام بھی "الدیوان" قرار پایا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ قدیم تقالید اور طرز فکر پر تنقید کر کے جدید مغربی خیالات سے شعراء کے دماغوں کو روشن کیا جائے۔ عقاد، مازنی اور شکری اس تحریک کے بنیادی روح رواں تھے۔ ناقدوں کی اس جماعت نے فکر کے نئے پیمانے وضع کیے جن پر مغربیت کی گہری چھاپ تھی۔ عربی شاعری میں تجدد پسندی کی تحریک نے فکر و تخیل کو روشنی بخشی اور ادیبوں اور شاعروں کے ذہن کی جدید طرز پر تربیت کی۔ ان ناقدوں نے قدیم روایات شعر و ادب پر دلائل سے پُر اور سخت اعتراضات کیے۔

اس تحریک کی اہمیت اس نقطہ نظر سے بہت زیادہ ہے کہ اس کے نمائندوں نے عملی طور پر نظم و نثر میں اپنے خیالات کا پوری طرح اظہار کیا۔ عبد الرحمن شکری نے "ضوء الفجر" شائع کر کے اپنے اشعار سے قدیم شاعری پر ایک عملی تنقید پیش کی۔

مازنی شعرائے مقلدین کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ الفاظ کی تزئین میں مبتلا ہیں مگر نفس انسانی کے اندرونی جذبات، زمانہ کے رجحانات اور سماجی اثرات سے دور رہ کر بے روح شاعری کرتے ہیں۔ ان کے اشعار قدماء کے مشابہ یا ان سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ ان کے اندر انسانی زندگی کے وسیع تجربات کا فقدان ہوتا ہے۔ مازنی، حافظ و شوقی کے اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے رسالہ "جریدہ" میں رقمطراز ہیں کہ ان کے اشعار میں ایک عمدہ اسلوب، پُرتکلف طرز بیان، شیریں الفاظ تراکیب میں متانت اور تخیل میں لطافت محسوس ہوگی لیکن اس طرز میں عیب یہ ہے کہ اس میں خود شاعر کی شخصیت غائب ہو جاتی ہے اور روح سماج و عصر کا پتہ کہیں دور دور نہیں چلتا۔ یہ شعراء عمدہ اشعار اور اچھی مثالیں پیش کرتے ہیں مگر ان میں جدید معنی اور جدید زندگی کی جھلک تک نہیں ہوتی ان کی نگاہیں قدیم شاعری کی طرف لگی رہتی ہیں اور اس سے وہ اخذ و اقتباس کرتے ہیں۔

اسی طرح مازنی نے حافظ ابراہیم کی شاعری پر تنقید کی اور بتایا کہ وہ سیاسی اور صحافیانہ طرز کی شاعری کرتے ہیں۔ وہ ایک خاص طرز کی صنعت گری سے کام لیتے ہیں جس سے کائنات، حقیقت اور حسن کے جلوے اجاگر نہیں ہو پاتے۔ مازنی حافظ ابراہیم کی شاعری کو مبالغہ آمیز، حقیقت سے بعید اور صداقت سے عاری قرار دیتے ہیں جس میں شاعر کے جذبات و احساسات کی تصویر کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ حافظ کے سرقات اور الفاظ کے غلط استعمال کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ مازنی نے حافظ پر جو تنقید کی ہے اس کے بعض حصے بے جان ہیں اور ان کے غلط طرز فکر کی ترجمانی کرتے ہیں۔

اس تحریک کے بانیوں نے اپنی تنقیدوں سے ایک فضا قائم کی اور شوقی و حافظ جیسے درجہ اول کے شعراء پر بے جھجک تنقیدیں کیں۔ عقاد "الدیوان" میں لکھتے ہیں کہ شاعر وہ ہے جو اشیاء کے جوہر تک پہونچ جائے محض ان کی اشکال و الوان پر قناعت نہ کرے۔ ایک چیز کو کئی طرز کی رنگین تشبیہوں سے پیش کرنا شاعری نہیں ہے شاعری دراصل کسی شئے کی ماہیت، جوہر اور زندگی سے اس کے تعلق کو پیش کرنے کا نام ہے۔ شاعری کوئی میدان مبارزت نہیں بلکہ خود اپنے مشاہدات و احساسات کو کائنات، زندگی اور سماج کے بارے میں پیش کرنے کا نام ہے۔ شاعر کو کسی شئے کے اندر پہونچ کر اپنے جذبات کے ساتھ اس کی گہرائی اور وسعت کو پیش کرنا چاہیے۔ تشبیہ کے بجائے نئے معانی، نفسیاتی تصویریں

ایم کوٹھیاوی راہی

غزل

وفورِ شوق میں یہ بھی نہ مجھ کو یاد رہا
کہ اس سے مل کے بچھڑ، بچھڑ کے مل نہ سکا گیا

میں وہ وجود ہوں خود کو مٹا دیا جس نے
مجھے پکارا رہا ہے بکھر کے ہر ذرہ

نہ کوئی فکر کا تارا نہ کوئی یاد کا چاند
چلی ہے آج فلک پر بھی کیا اجل کی ہوا

تجھے بھی اہل شرافت میں خوار ہونا ہے
نہیں تو بیٹھ مکاں میں ہمارے ساتھ نہ آ

سنائی دیتی ہے شہروں میں آج بھی راہی
وہی اداس خروشی وہی شبوں کی صدا

اور اشیاء و امور میں گہرے تفکر کی ضرورت ہے خارجی حس کے ساتھ داخلی احساس، شعور اور جذبہ کو بھی شعر میں منتقل کرنا ضروری ہے۔

عقاد شوقی کے مراثی کو خالص تقلیدی قرار دیتے ہیں اور کہتے کہ اگرچہ اس میں فلسفۂ موت و حیات کا ایک وسیع میدان ہے مگر شوقی محض تقلید سے کام لیتے ہیں بلکہ تقلید میں بھی سطحی درجہ تک رہ جاتے ہیں حالانکہ ان سے قبل متنبی اور معری نے کہیں کہیں موت و حیات کے بارے میں اعلیٰ فلسفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور زندگی کے بارے میں پائدار تجربات پیش کئے ہیں۔

عقاد شوقی کے قصائد پر وحدت کی کمی اور بے ترتیبی کا الزام بھی لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قصائد میں جسم انسانی کی سی وحدت درکار ہے۔ شکری نے اپنے دیوان کے پانچویں حصہ میں مازنی پر یہ تنقید کی کہ وہ مغربی ادیبوں پر تنقید بھی کرتے ہیں اور بلا ان کا حوالہ دئے ان کے افکار اپنے نام سے شائع بھی کر دیتے ہیں۔ مازنی نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں اس کا اعتراف کیا ہے۔

جب عقاد اور مازنی نے کتاب "الدیوان" شائع کی تو اس میں دو فصلیں شکری پر تنقید کے لئے وقف تھیں۔ مازنی نے شکری پر سخت تنقید کر کے ان کی اس تنقید کو رد کیا جو انھوں نے حافظ کی شاعری پر کی تھی۔

اس تحریک میں شریک ناقدوں کے خیالات اور پھر ان میں آپس میں تنقیدی مناقشات نے ایک ادبی تنقید کی فضا سے عربی ادب کو زندگی و تابندگی کی دولت عطا کی۔

بہر حال مازنی و شکری کا معرکہ اس طرح ختم ہوا کہ مازنی نے شاعری کو چھوڑ کر صحافت و سیاست کی راہ لی۔ شکری نے بھی شاعری سے پیچھا چھڑایا اور میدان میں صرف عقاد رہ گئے۔ وہ اپنے خیالات و نظریات پر جو شاعری کے بارے میں انھوں نے "الدیوان" میں پیش کئے تھے قائم رہے اور مسلسل اپنے کلام کے مجموعے پر مجموعے شائع کرتے رہے۔ ان کے اشعار میں اکثر انگریزی شعرا شیکسپیر و شیلی وغیرہ کے اثرات کا اظہار ہوتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس تنقیدی تحریک نے فکر و نظر کو جلا بخشی اس تحریک کے ناقدوں نے حافظ و شوقی جیسے عظیم شعراء پر بصیرت انگیز تنقیدوں سے فکر کے گوشوں کو اجاگر کیا اور اس طرح اہل نظر ان کی تنقیدی کاوشوں کے اجالے میں خوبی و خامی کا اندازہ کرنے کے لائق ہو سکے۔ اگرچہ تحریک کی ابتدا کے وقت اعلان کیا گیا تھا کہ "الدیوان" دس جلدوں پر مشتمل ہوگی مگر صرف دو حصے ہی منظر عام پر آ سکے۔ پھر ان تنقیدوں نے جدید طرز فکر کی دعوت کو عام کیا اور ادبی تنقید میں ایک نیا انداز نظر پیش کیا جو قدیم عربی تنقید سے قطعاً مختلف تھا۔

ماخذ: (۱) ادب المعاصر فی مصر تالیف شوقی ضیف
(۲) فی ادب الحدیث ج ۲ تالیف عمر الدسوقی
(۳) تطور الشعر العربی الحدیث

ماہر حسین فہمی

انجمن کی مطبوعات

۱۔ اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ	ڈاکٹر محمد عزیر	۵/۵۰
۳۔ نسیم خرب	امیر چند بہار	۲/۵۰
۴۔ نئے ڈرامے	ڈاکٹر محمد حسن	۵/-
۵۔ ہندوستانی اخبار نویسی	محمد عتیق صدیقی	۱۲/۵
۶۔ تنقیدیں	ڈاکٹر خورشید الاسلام	۴/۵۰
۷۔ باز دید	ڈاکٹر خلیب الرحمن	۳/۵۰
۸۔ اردو ہندی لغت	مرتبہ انجمن ترقی اردو (ہند)	۴/۵
۹۔ اردو صرف و نحو	مولوی عبد الحق	۱/۲۵
۱۰۔ ادبی اور قومی تذکرے	پنڈت کشن پرشاد کول	۴/۵۰
۱۱۔ اردو ساہتیہ کا اتہاس	سید احتشام حسین	۶/۲۵
۱۲۔ اردو غزل (جدید ایڈیشن)	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۹/-
۱۳۔ اخلاقی سماجیات	ڈاکٹر جعفر حسن	۴/۵۰
۱۴۔ الایام (اردو ترجمہ)	ڈاکٹر طٰہٰ حسین مترجم سید عبد الباقی شطاری	۴/۰۰
۱۵۔ انتخاب شرح دیوان مومن	حامد حسن قادری	۳/۵۰
۱۶۔ انتخاب کلام میر	مولوی عبد الحق	۲/۵۰
۱۷۔ انجم کدہ	عزیز لکھنوی	۲/۵۰
۱۸۔ بچوں کے ادب کی خصوصیات	مشیر فاطمہ	۱/۰۰
۱۹۔ بھگوت گیتا	محمد اجمل خاں	۲/۵۰
۲۰۔ پرچھائیں	آصف علی	۴/۰۰
۲۱۔ تاریخ جمالیات	مجنوں گورکھپوری	۲/۰۰
۲۲۔ تذکرۂ گلشن سخن	مسعود حسن رضوی	۶/۰۰
۲۳۔ چند ہم عصر	مولوی عبد الحق	۱/۵۰
۲۴۔ روز گار شرح سود اور زر	ابو سالم	۵/۵۰
۲۶۔ دھمپد	منور لکھنوی	۳/۰۰
۲۷۔ نوائے ظفر	ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی	۲/۲۵
۲۸۔ یادگار رسال (جدید ایڈیشن)	بیگم صالحہ عابد حسین	۴/۵۰
۲۹۔ کلام سودا	خورشید الاسلام	۶/۰۰

مراسلات

مولوی عبدالحق کی بیوی

آج ۲۵ رجولائی مولوی صاحب مرحوم کی بیوی کے شوہر کے بیٹے سے ملاقات ہوئی۔ ہارون احمد جو ہاپڑ کے رہنے والے ہیں اور عرف عام میں ڈپٹی صاحب مشہور ہیں چھٹی جماعت تک پڑھا ہے اور مولوی صاحب کے چلے جانے کے بعد سے بیکار ہیں۔ اس وقت اپنی عمر ۶۵ سال کے قریب بتاتے ہیں۔ جب ۱۹۴۷ میں انجمن کے دفتر (واقع کوٹھی ڈاکٹر انصاری دریا گنج) پر حملہ ہوا تو ان کا بیان ہے کہ وہ دفتر میں موجود تھے اور یہ کہ دریا گنج کے لوگوں نے فسادیوں کو منتشر کر دیا اور وہ لوگ سوائے باہر کے کواڑوں کو نقصان پہنچانے کے اور کچھ نہ کر سکے۔ مولوی صاحب ان کا بیان ہے اس وقت قائم گنج (ذاکر صاحب کا قصبہ) کے دورے پر تھے اور دفتر کے انچارج اس وقت ہاشمی صاحب تھے۔

ان سے مزید معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کے ایک بھائی ضیاء الحق صاحب تو تھے ہی، ایک چھوٹے بھائی احمد حسن بھی تھے جو سیہور میں انجینیر تھے اور ان کا بیٹا بھوپال میں ایگزیکٹیو انجینیر تھا۔ مولوی صاحب کے بھانجے شیخ حامد حسن صاحب محلہ قانون گویان میں اب بھی رہتے ہیں جن کے قریب ہی مولوی صاحب کا اپنا آبائی مکان بھی ہے جس میں ایک پنجابی سوداگر شیخ عبدالسلام رہتے ہیں۔ ہاپڑ میں اب بھی ۲۱-۲۲ ہزار مسلمان ہیں پاکستان ادھر سے کم ہی لوگ گئے۔ ان کے بقول تو صرف سات۔ جن کے وہ نام تک بتاتے تھے!

لیکن سب سے زیادہ معرکہ کی بات جو اپنے ڈپٹی صاحب نے بتائی وہ یہ تھی کہ (ڈپٹی صاحب) ہارون احمد صاحب کی والدہ سعیدہ کے انتقال کے بعد جب راوی کی عمر ڈھائی تین سال کی رہی ہوگی راوی کے والد نے ایک اور شادی کی۔ ہاں یہ بات میں نے ذرا قبل از وقت شروع کر دی اصل میں راوی میرے پاس آئے تو اپنا تعارف اس طرح کرایا کہ میں مولوی عبدالحق صاحب کا عزیز ہوں۔ اس بارے میں میں نے مزید تفصیل چاہی تو کہہ دیا کہ وہ میرے تایا ہوتے تھے۔ اب صرف تایا سے میرا کام تو نہیں چلتا تھا میں نے اور کریدا تو رشتہ خاصا نازک تر نکلا۔

کہ مولوی صاحب نے شادی کے چند ہی دن بعد اپنی بیوی کو طلاق دیدی اور راوی کے بقول ان کے والد سے کہا کہ تم شادی کر لو انھوں نے شادی کر لی کیونکہ ان کی پہلی بیوی کا کچھ ہی عرصہ پہلے انتقال ہو چکا تھا میں نے پوچھا مولوی صاحب نے طلاق کیوں دیدی۔ اس کا انھوں نے یہ جواب دیا کہ ناچاقی ہو گئی تھی مگر ناچاقی کی وجہ؟ انھوں نے بیان بدل کے اس طرح تقریباً کی کہ مولوی صاحب کے والد شیخ علی حسینی صاحب نے بالا ہی بالا شادی طے کر دی تھی مولوی صاحب حیدر آباد میں رہتے تھے شادی ہوئی دو تین روز ہاپڑ میں ٹھہرے پھر بیوی کو ساتھ لے جانے کے لئے کہا جس پر ان کے سسر شیخ محمد الیاس رضامند نہیں ہوئے مولوی صاحب نے کہا میں گھر داماد تو ہونے سے رہا۔ اور طلاق دیدی! ان خاتون کا نام ذکر النساء تھا جن کے انتقال کو راوی کے بقول چوتھا برس ہے۔ راوی کے والد کے انتقال کو نواں برس ہے اس شادی پر راوی کے بقول مولوی صاحب ان کے والد سے بے حد خوش تھے۔

دلچسپ بات یہ ہوئی کہ ان سب کچھ پوچھنے کے بعد بھی۔ اب جب میں نے اپنے نوٹس دیکھے تو راوی کے والد کا نام پوچھنا بھول ہی گیا جو اگلی ملاقات میں پتہ چل سکے گا جو دیکھیے کب ہو۔ ایک ضروری بات یہ بھی ہے کہ راوی بظاہر تو معتبر ہی معلوم ہوتے تھے لیکن ۱۹۴۷ کے بعد سے ان کا حال اور مشغلہ شاید خاص معتبر نہیں اس لئے!!!

(از "حرب")

اردو دوستوں سے سوال

قومی زبان جلد ۷۰۔ شمارہ (۲۰) مورخہ ۲۲ رمئی ۱۹۹۸ء میں اداریہ بعنوان "اردو دوستوں سے خطاب" دلچسپ ضرور ہے مگر اس سوال سے متعلق چند اہم امور قابل توجہ بھی ہیں۔ اداریہ میں یہ لکھا ہے کہ "اردو میں مختلف علوم و فنون کی معیاری کتابیں نہیں ملتیں" اور ان کی ضرورت بتلائی گئی ہے۔ علوم و فنون میں ٹکنیکل مضامین مثلاً ڈاکٹری و انجینیرنگ وغیرہ بھی شامل ہیں اور ان مضامین کی کتابیں لکھنے اور تعلیم حاصل کرنے کے لئے فنی اصطلاحات سے واقف ہونا ضروری ہے اس لئے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سائنٹیفک اور ٹکنیکل اصطلاحات کس زبان میں استعمال کی جائیں خصوصاً جبکہ اردو زبان میں ان کا وجود نہیں ہے۔

جامعہ عثمانیہ میں جب اردو زبان ذریعہ تعلیم تھی اور وہاں یہ زبان عروج پر تھی اس زمانہ میں ایسی اصطلاحات کا ترجمہ زیادہ تر عربی و فارسی زبانوں سے الفاظ لے کر کیا گیا تھا مگر وہ تجربہ بہت ہی تلخ رہا اور وہ اصطلاحات اس قدر ثقیل تھیں کہ خود طلبہ کے لئے دشواریاں پیدا ہو گئیں۔ مثلاً ڈاکٹر نسخہ میں ادویہ کے نام کس زبان میں لکھے؟ اگر وہ اردو میں مستعمل ہوئے الفاظ میں ادویہ کے نام لکھے تو بازار میں عام طور سے ان ناموں سے ادویہ ملنا یا نسخہ بندھوانا غیر ممکن ہوگا تاوقتیکہ خود دوا ساز ان ناموں سے واقف نہ ہو اور کتنے دوا ساز ایسے ملیں گے جو دواؤں کے اردو میں ترجمہ کئے ہوئے ناموں سے واقف ہوں گے۔ گھوم پھر کر یورپ و امریکہ میں دواؤں کے نام جو رائج ہیں وہی استعمال کرنا ہوگا تاوقتیکہ

ہندی میں ڈھالے ہوئے جدید اصطلاحات کا استعمال سارے ہندوستان میں مقبول عام نہ ہو جائے۔ ہندی پھر بھی سارے ہندوستان کے لئے ایک قومی زبان ہے مگر نہ تو اردو کو اور نہ کسی دوسری علاقائی زبان کو وہ درجہ حاصل ہے جو ہندی کو۔

اس کے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طلبہ کے تعلیمی نصاب میں اگر ہم اردو کی ان اصطلاحات کسی طرح شامل بھی کرلیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا اور کہاں اور کس طرح ان کے استعمال کا موقع مل سکے گا اور ایسے طلبہ کی کھپت کہاں ہوگی۔ یہ عملی دشواریاں ہیں اس لئے قبل اس کے کہ زبان اردو میں ہم علمبردارزی اختیار کریں ان مشکلات پر غور کرلینا ضروری ہے۔ علمبرداری سے میرا منشاء زبان کو فصیح و بلیغ بنانے کا ہے اور تمام ٹکنیکل اصطلاحات کا ترجمہ اردو میں ہونے کا ہے۔ اور اگر بہ لحاظ حالات زمانہ یہ ممکن نہیں ہے تو سوائے اس کے کہ زبان کو سیدھا سادہ اور عام فہم بنائے رکھنے کے دوسری صورت نہیں ہے۔ سہولت بھی اسی میں زیادہ ہوگی اور زبان اردو کا وجود برقرار رہ سکے گا۔

جامعہ عثمانیہ میں جو کچھ انگریزی کتابوں سے ترجمہ کا کام کیا گیا تھا وہ سب ایک قسم کا نقلی کام تھا۔ اور نقل کام کی نہ تو وہ قدر ہو سکتی ہے اور نہ اس قدر مفید ہو سکتا ہے جس قدر کہ اصلی کام۔

آئندہ واقعات جو رونما ہونے والے ہیں ہم کو ان پر بھی غور کرلینا چاہئے مثلاً ہر صوبہ یا اسٹیٹ میں اب جب کہ علاقائی زبان پر زور دیا جا رہا ہے تو ان حالات میں آئندہ چل کر اردو زبان میں بھی اہم تبدیلیاں واقع ہوں گی وہ اس طرح کہ ہر اسٹیٹ کی اردو زبان میں کچھ نہ کچھ علاقائی زبان کے الفاظ مل جل جائیں گے اور ایک اسٹیٹ کے مقابلہ میں دوسری اسٹیٹ کی زبان اردو میں کچھ نہ کچھ فرق ہوگا۔ مثال کے طور سے آندھرا پردیش کو لیجئے یہاں اردو زبان میں بہت کچھ تلنگی الفاظ شامل ہو جائیں گے اور تامل ناڈو کی اردو میں تامل الفاظ ہوں گے۔ اردو از خود کوئی خالص زبان نہیں ہے اور اس کو وسعت دینے کے لئے علاقائی زبانوں کے الفاظ مل جل جانا کوئی نئی بات نہ ہوگی اور نہ اس کو کوئی طاقت روک سکے گی۔

بجائے اس کے کہ ہم مخصوص اردو کے واسطے کوئی علیحدہ یونیورسٹی یا بڑے بڑے کالج قائم کرنے کی سوچیں ہم کو پہلے بنیاد کو مضبوط بنانا ہے تاکہ سیدھی سادی عام فہم زبان اردو جو اس وقت رائج ہے اس کا وجود قائم رہے۔ اگر بنیاد ہی مضبوط نہ ہوگی تو علیحدہ یونیورسٹی یا کالجوں کے قیام کا کیا نتیجہ ہوگا اور جہاں سے نکلے ہوئے طلبہ کی کھپت کے مواقع کیا ہوں گے؟

بہتر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر اسٹیٹ کی ہر یونیورسٹی اور کم از کم ہر کالج میں ایک شعبہ اردو مضمون کا رہے اس طرح دائرہ وسیع ہوگا اور ہر شہر کے ہر محلہ میں کم از کم ایک اردو مکتب قائم کیا جائے۔ اردو پڑھانے کے لئے کچھ والنٹرز بھی پیدا کئے جائیں اور حکومت سے امداد بھی حاصل کی جائے۔ کچھ ایسے رسالوں کی بھی اشاعت کی جائے جن کے ذریعے اردو کی تعلیم ہر گھر کے بچوں کو دی جائے تاکہ اردو کا ذوق شوق عوام الناس میں رہے اور جو لطف عوام کو سینما گھروں یا ریڈیو پر کارڈ سننے میں آتا ہے وہ برقرار رہے۔ (مرزا حبیب اللہ بیگ)

ایڈیٹر ہماری زبان کے نام

۱۔ اردو میں یورپی زبانوں کے ادب کے انتقال کی رفتار اطمینان بخش ہے لیکن دوسری زبانوں کے معاملہ میں یہ بات نہیں ہے۔ خصوصاً ترکی ادب (اور جاپانی و عربی وغیرہ بھی) ضرورت ہے کہ اہل زبان اس طرف توجہ کریں۔

۲۔ انجمن کے مرحوم رسالہ سائنس کا دوبارہ اجراء وقت کی اہم ضرورت ہے کہ اردو کو آخر صرف شعر و ادب ہی جاندار نہیں بناسکتا! بلا تاخیر اس پر توجہ دینی چاہئے۔

۳۔ ۸/جون کے "میرا صفحہ" کے تحت آپ نے میرے دل کی بات کہی کہ اپنے ملک کی علاقائی زبانوں کے ادب کی اردو میں نمائندگی خاطر خواہ ہونی چاہئے۔ ریاستی انجمنوں کو یہ کام فوری شروع کرنا چاہئے۔

۴۔ آئے دن مشاعرے اور جلسے منعقد ہوا کرتے ہیں۔ ایسے مواقع پر اردو کی تاریخ اور اردو کی ترقی میں غیر مسلموں کا حصہ کے عنوان سے علاقائی زبانوں میں مختصر کتابچے شائع کروا کر مفت تقسیم کردینے چاہئیں۔ کہ اسی ذریعہ سے غیر اردو داں لوگ اردو والوں کے موقف کو ٹھیک طور پر سمجھ سکیں گے۔ یہ ایک ٹھوس خدمت ہوگی اور وقت کی پکار بھی یہی ہے۔ (ابن غوری دکنی)

ایک استفسار کے جواب میں

مجاز الدین صاحب کے استفسار کے سلسلے میں عرض ہے کہ ان کی مطلوبہ نظم حکیم ناصر خسرو (۱۰۰۵ء - ۱۰۸۱ء) کی ہے جو "دیوان قصائد و مقطعات حکیم ناصر خسرو" میں درج ہے دیوان میں اس نظم کا کوئی عنوان نہیں ہے اور متفرقات نامی باب میں درج ہے۔ طہران میں شائع شدہ دیوان کی کاپی آصفیہ کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس نظم کا نہایت عمدہ انگریزی ترجمہ پروفیسر ہادی حسن مرحوم نے کیا ہے جو ان کی A GOLDEN TREASURY OF PERSIAN POETRY میں درج ہے۔ یہ کتاب نیشنل بک ٹرسٹ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

(حسن اسیم)

آگرہ یونیورسٹی میں اردو کی راہ میں دشواریاں

ڈپٹی کمشنر لسانی اقلیت سے ریاستی انجمن ترقی اردو کا وفد ملا

لکھنؤ: ریاستی انجمن ترقی اردو کے ایک وفد نے جو جناب حیات اللہ انصاری ایم۔پی خازن بیگم سلطانہ حیات نائب صدر جناب راحت علی خاں جنرل سکریٹری جناب احمد ابراہیم علوی۔ مولانا محمد ہاشم فرنگی محل اور سید فدا حسین ممبران مجلس عاملہ پر مشتمل تھا جناب جی۔این تڑانگ ڈپٹی کمشنر اقلیت سے ملا۔ ریاستی انجمن کے جنرل سکریٹری جناب راحت علی خاں نے ایک یادداشت ان کے سامنے رکھی جس میں پرائمری اور ثانوی سطح پر ریاست میں اردو پڑھنے والے طلبہ کی دشواریوں کے ساتھ آگرہ یونیورسٹی میں نصاب کی تبدیلی سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں سے ان کو آگاہ کیا گیا ہے نصاب کی اس تبدیلی سے اب اردو یا ہندی میں سے طلبہ ایک ہی مضمون لے سکیں گے۔ سہ لسانی فارمولے کے تحت کچھ جگہوں پر اردو ٹیچروں کا تقرر کیا گیا ہے۔ لیکن ایسے ٹیچروں کو تعلیمی سیشن کے ختم ہونے سے پہلے ٹرینڈ نہ ہونے کی وجہ سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ یادداشت میں کہا گیا ہے کہ ایسے ٹیچروں کے لئے تھوڑی مدت کے ریفریشر کورس کا بندوبست کر کے انہیں ٹریننگ سے مستثنیٰ کیا جائے جیسا کہ پہلے زبان کے ٹیچروں کے لئے ایسا ہی انتظام تھا۔ سرکاری اعلان کے باوجود اہم قوانین کا اردو ترجمہ، اردو میں فہرست دوٹران دفتروں میں اردو میں درخواستیں دینے کی اجازت اور داخل خارج کے مقدموں کی نوٹسیں اردو میں جاری کرنے کی کوئی سہولت موجود نہیں ہے۔ محکمہ حفظان صحت کی طرف سے متعدی امراض وغیرہ کے تحفظ کے اشتہارات وغیرہ اردو میں شائع نہیں ہوتے ہیں۔

بہار میں اردو آبادی کے سروے کا کام جلد شروع ہوگا

پٹنہ: بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کا جلسہ زیر صدارت جناب غلام سرور صدر انجمن، انجمن اسلامیہ ہال میں منعقد ہوا جس میں حسب ذیل حضرات نے شرکت کی:-

جناب غلام سرور، مولانا بیتاب صدیقی، غضنفر نواب دانش، پروفیسر عبدالمغنی، محمد تقی رحیم، شاہ مشتاق احمد، شاہد رام نگری، شمشاد علی خاں یعقوبی (سیوان)، باسط عظیم آبادی (جگر دھر پور)، جوہر نظامی (سمری بختیار پور)، محمد زین الحق (کٹیہار)، پروفیسر مظفر اقبال (بھاگل پور)، عثمان یوسف (پٹنہ سٹی)، اعجاز امام فلسفی (پھلواری شریف)، محمد حسین انصاری (دانا پور)، خواجہ نواب منظر صدیقی (سکندرہ)، اظہار عالم، معصوم شرقی صاحبان۔

۱۔ طے کیا گیا کہ انجمن کا ایک وفد صدر انجمن کی قیادت میں گورنر بہار سے ملاقات کر کے ان سے گذارش کرے کہ اردو کے سلسلے میں حکومت کی جانب سے جن اقدامات کا فیصلہ ہو چکا ہے ان کو مستعدی کے ساتھ روبہ عمل لایا جائے ساتھ ہی اردو کے سلسلہ میں کی جانے والی بعض زیادتیوں کی تلافی کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائے۔

۲۔ یہ جلسہ بہار کی بعض یونیورسٹیوں کی اس غیر جمہوری عمل کے خلاف شدید احتجاج کرتا ہے کہ ان کے نصاب تعلیم میں انگریزی کی جگہ جن زبانوں کی تعلیم تجویز کی گئی ہے ان میں اردو کا نام نہیں ہے

۳۔ طے کیا گیا کہ مندرجہ ذیل اصحاب پر مشتمل اردو کے سلسلے میں اعداد و شمار فراہم کرنے کے لئے ایک سروے کمیٹی مقرر کی جائے چنانچہ پروفیسر سید مظفر اقبال، جناب زین الحق ایم۔کام، جناب شمیم ربانی اور جناب کمال الدین صدیقی۔ کمیٹی کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے کاموں کی تفصیلات مرتب کر کے عملی اقدامات کرے۔

۴۔ طے کیا گیا کہ جن سب ڈویژنوں میں اردو میڈیم اسکول نہیں ہیں وہاں کی شاخوں کو ہدایت کی جائے کہ وہ اپنے علاقے میں اردو میڈیم اسکول قائم کرنے کے وسائل پر غور و فکر کر کے ریاستی دفتر کو مطلع کریں اور اس سلسلے میں اس کے ساتھ مراسلات کریں۔

دہلی یونیورسٹی کے بی اے (مراسلاتی) کورس میں اردو کو بھی اختیاری مضمون بنایا جائے

سکریٹری انجمن ترقی اردو دہلی نے وائس چانسلر کو میمورنڈم پیش کیا

نئی دہلی ۱۱ جولائی۔ دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ دہلی یونیورسٹی کی جانب سے بی اے کے مراسلاتی کورس میں اردو کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے شامل کیا جائے۔ یہ مطالبہ ایک میمورنڈم میں کیا گیا ہے جو انجمن ترقی اردو دہلی کے جنرل سکریٹری جناب بہار برنی نے دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر گنگولی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میمورنڈم پر ان طلبہ کے دستخط بھی ہیں جو اس سہولت سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔

میمورنڈم میں کہا گیا ہے کہ اردو اس ملک کے دو کروڑ تیس لاکھ آدمیوں کی مادری زبان ہے جو ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں یہ اس وقت ہندوستان کی ستر میں سے ۵۰ یونیورسٹیوں میں اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائی جا رہی ہے اور دہلی یونیورسٹی وہ پہلی یونیورسٹی ہے جس نے آزادی کے بعد اردو کا شعبہ قائم کیا تھا۔ اس لئے یہ خواہش قدرتی ہے کہ اس یونیورسٹی کے بی اے کے مراسلاتی کورس میں اردو کو شامل کیا جائے۔

اردو کی تعلیم کی راہ میں دشواریاں

لکھنؤ۔ دینی تعلیمی کونسل نے ۱۳ جولائی کو ڈپٹی لسانی کمشنر کو ایک تو جہ نامہ بھیجا تھا۔ اس میں کہا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں تخمیناً ۸۰ ہزار پرائمری ٹیچرس تھے جو اردو اور ہندی دونوں زبانیں جانتے تھے۔ ہیں

سال کے اندر ان کی اکثریت کا یا تو انتقال ہو گیا یا ریٹائر ہو گئے ان کی جگہ خالص ہندی والے ٹیچرس کا تقرر کیا گیا علاوہ ازیں اب تک مختلف پلانوں کے تحت ڈیڑھ لاکھ یا سوا لاکھ نئے ہندی پرائمری ٹیچرس کا تقرر کیا جا چکا ہے۔ ان میں سے شاذ و نادر ہی ایسے ہوں جو اردو زبان بھی جانتے ہوں اردو ٹیچرس کی ٹریننگ کا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا ہے ٹریننگ کے لئے ٹیچرس کے انتخاب اور ان کی ملازمت کے سلسلے میں اردو جاننے کی شرط ہٹا دی گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دن بدن اردو ٹیچرس کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب شاید پرائمری اسٹیج میں اردو ٹیچرس کا وجود ہی باقی نہ رہے جونیئر اسٹیج کی بھی حالت قابل اطمینان نہیں ہے۔ جب پرائمری اسٹیج میں اردو کی تعلیم کا بندوبست نہیں ہوگا تو جونیئر اسٹیج میں اردو پڑھنے والے طلبہ کہاں سے آئیں گے۔ ڈپٹی لسانی اقلیتی کمشنر کی توجہ وزراء تعلیم کانفرنس منعقدہ دہلی اگست ۱۹۴۹ء کے اس ریزولیوشن کی طرف بھی دلائی گئی ہے جس میں طے ہوا تھا کہ کسی اسکول کے طلبہ کی ⅓ تعداد ایسی ہو جو ہندی کے بجائے اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں تو ان کے لئے ان کی مادری زبان میں تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ مگر یو۔پی گورنمنٹ نے اس پر عمل درآمد کا بندوبست نہیں کیا۔ ایجوکیشنل کوڈ میں ایسی ترمیم نہیں کی گئی جس سے کسی اسکول میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جا سکے۔ اس کے لئے نہ ٹیکسٹ بک کا بندوبست کیا گیا۔ اور نہ اردو میں امتحان لینے کا انتظام کیا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود کہ یوپی میں قریب ڈیڑھ سو سے لے کر دو سو تک اسلامیہ جونیئر ہائی اسکول اور کالج مسلمانوں کی زیر نگرانی چل رہے ہیں۔ مگر ایک اسکول بھی اردو میڈیم اسکول نہیں حالانکہ آندھرا پردیش، مدھیہ پردیش اور مہاراشٹر وغیرہ میں اردو میڈیم اسکول اور ہائی اسکول اب بھی موجود ہیں۔ اردو کو بطور زبان پڑھانے کی جو سہولتیں پہلے تھیں وہ سہ لسانی فارمولا کے نفاذ کے بعد ختم کر دی گئیں مرکزی حکومت کی واضح ہدایات اور بار بار یاد دہانیوں کے باوجود سنسکرت کو لسانی فارمولا میں شامل کیا گیا اور ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ بچہ سنسکرت لینے کے لئے مجبور ہو جائے۔ اس طرح بطور ایک زبان کے اردو اور ملک کی دوسری جدید زبانوں کی تعلیم کے لئے راہ مسدود کر دی گئی حکومت ہند نے جو اعداد و شمار اڈیشنل لینگویج ٹیچنگ کے سلسلے میں شائع کئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سال ۱۹۶۴ء و ۱۹۶۵ء میں پورے صوبے میں ہندی کے علاوہ اور زبانوں کے ٹیچر ۵۱۱ تھے جس میں سے سنسکرت کے ۲۹۸ تھے گویا کل مجموعہ کا تخمیناً ۶۰ فیصد سنسکرت پر ہیں۔ حکومت نے سنسکرت کو سہ لسانی فارمولا میں بطور ایک زبان کے پڑھانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سنسکرت کو ہندی کا جزو بنا دیا۔ ہندی کے پرچہ میں بیس نمبر کی سنسکرت لازمی کر دی گئی ہے جس کا نتیجہ عملاً یہ ہوتا ہے کہ سنسکرت زبان لینے والے طلبہ کے مقابلے میں اردو یا دیگر جدید زبانوں والے طلبہ ہندی میں نمبر کم پاتے ہیں بلکہ اکثر فیل ہو جاتے ہیں اس طرح طلبہ مجبور کئے جاتے ہیں کہ وہ اپنی مادری زبان چھوڑ کر سنسکرت لیں علاوہ ازیں اردو میں جو کتابیں رائج ہیں وہ بہت سخت ہیں۔ پرائمری اور جونیئر ہائی اسکولوں میں اردو کی تعلیم کی راہ میں جو مشکلات پیدا کر دی گئی ہیں ان کی موجودگی میں چند ہی طالب علم ایسے ہو سکتے ہیں جو ہائی اسکول یا انٹرمیڈیٹ میں اردو بطور زبان پڑھنے کی اہلیت یا ہمت رکھتے ہوں اگر وہ ارادہ بھی کریں تو اسکولوں میں مختلف مضامین کا جوڑ اس طرح رکھا گیا ہے جس کے ماتحت کوئی اچھا طالب علم اردو لینا پسند نہیں کرتا۔

ان حالات میں ڈپٹی کمشنر لسانی اقلیتوں سے درخواست کی گئی کہ وہ حکومت کے محض کاغذی اعلانات اور نام نہاد مراعات پر اپنی رائے قائم نہ کریں۔ عملی دشواریوں کو دیکھیں اور ان کا حل تلاش کریں۔

(قومی آواز)

انجمن ترقی اردو ہند شاخ ٹیا پوکھر کا جلسہ

انجمن ترقی اردو شاخ ٹیا پوکھر کے زیر اہتمام محترم جناب سالک لکھنوی کی صدارت میں ایک سیمینار منعقد ہوا۔ جس میں "مغربی بنگال میں اردو کا حال اور مستقبل" زیر بحث آیا۔ صدر محترم نے اپنی فاضلانہ تقریر میں تاریخی پس منظر کے ساتھ اس حقیقت پر کافی زور دیا کہ زندہ رہنے والی قوم کی زبان کبھی نہیں مٹتی۔ آپ نے اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے کہ کسی صوبے کا لسانی مسئلہ دراصل پورے ملک کے لسانی مسئلے کا ایک جز ہوتا ہے اس صورت حال پر روشنی ڈالی کہ موجودہ ملکی سیاست کے منتظر گوشے اب خود اپنے مفاد کے پیش نظر اپنی اردو دشمنی پر کچھ پشیمان سے دکھائی پڑ رہے ہیں۔ آپ نے ملک کی سیاست میں ایک ابھرتی ہوئی روشن تبدیلی کا تذکرہ کرتے ہوئے اردو کے روشن مستقبل کی کچھ واضح توقعات کا اظہار کیا۔ مباحثے میں جناب اویس احمد دوراں (جناب غلام سرور، سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند شاخ کلکتہ) جناب مشتاق الحسن (سکریٹری کلکتہ کارپوریشن اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن) جناب مولانا عبد الحلیم شمسی اور جناب شوکت احمد (سکریٹری کانزی ریڈرس سرکل) نے خاص طور پر حصہ لیا۔ کلکتے کی انجمن کی تمام علاقائی شاخیں بھی مدعو تھیں۔ جناب الحاج شمس الدین صاحب (صدر انجمن) نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا نشست کے بعد چائے سے حاضرین کرام کی ضیافت کی گئی۔ نشست کے شروع میں "انتخاب اشعار غالب" کے مقابلے کے انعامات بھی تقسیم کئے گئے۔

انجمن اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتی ہے کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے جانشین وحشت حضرت شاکر کو ہم سے اچانک چھین لیا۔ دنیائے اردو اس سانحہ پر ملال پر جتنا غم و صدمہ کرے کم ہے۔

(احد مبین انور جنرل سکریٹری)

انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام نیلور میں مشاعرہ

انجمن ترقی اردو (ہند) نیلور کے زیر اہتمام آٹھواں سالانہ مشاعرہ ۵ر جولائی ۱۹۹۸ء کو ذریعہ موٹر سروس کے وسیع میدان میں شب کے دس بجے

منعقد کیا گیا۔

مشاعرہ کی صدارت حضرت کاوش بدری صاحب بی اے مصنف مثنوی قبلہ نما و شرد عا کلی نے کی۔ دوران تقریر آپ نے ارشاد فرمایا کہ "اردو زبان کی ترویج میں دکنی صوفیائے کرام نے پہل کی تھی اور اپنے مسلک کی تبلیغ کے لئے اسی زبان کو منتخب کیا۔ اردو کی عالمگیرانہ ہمہ گیری کا راز اولیائے کرام کے مقدس ہاتھوں اس کی بنیاد ہے" اس سلسلہ میں شہر نیلور کے اولیائے کرام کی خدمات عالیہ کو سراہتے ہوئے فرمایا کہ "غالب مرحوم پر اردو دنیا کو ناز ہے اور غالب مرحوم کو اپنے قابل فخر صاحب دیوان شاگرد محمد حبیب اللہ ذکا نیلوری پر ناز تھا۔ جو سرزمین نیلور سے تھے" اردو کے ان دونوں مشہور و معروف اساتذۂ فن غالب و ذکا نیلوری کے دوستانہ تعلقات و ادبی خدمات پر اپنے تحقیقاتی انکشافات بھی پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ جس کا بہت کچھ حصہ تاریخ ادب اردو سے مخفی رہا یا حذف کیا گیا جسے اب اخفائے راز میں نہیں رکھا جاسکتا اور یہ کام اردو کے ریسرچ اسکالروں کا ہے"۔

اس مشاعرہ میں قابل ذکر بیرونی شعراء میں اجمل سعیدی بدر حیدرآبادی سالار مختار عقیل مدراسی اقیم صدیقی انور کڈپوی اور حبیب کڈپوی او بہجت شامل تھے اور مقامی شعراء میں ڈاکٹر ناز، تسنیم، واحد، روح، جیتی ساحر، شیدا کے علاوہ دیگر مقامی و مضافاتی ممتاز شعراء نے شرکت کی۔

(عبدالرؤف۔ صدر انجمن ترقی اردو ہند نیلور)

سہ لسانی فارمولہ میں جنوب کی زبانیں پڑھنے پر زور قومی پالیسی کا اعلان

نئی دہلی۔ مرکزی کابینہ نے معمولی ترمیموں کے ساتھ وزارت تعلیم کے اس ریزولیوشن کی منظوری دے دی جس میں بیس سال کے واسطے قومی تعلیمی پالیسی کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ریزولیوشن تعلیم کمیشن کی رپورٹ پر مبنی ہے البتہ اس میں ہندوستانی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں ممبران پارلیمنٹ مختلف پارٹیوں کے نمائندگان اور ریاستی وزراء تعلیم کی ترمیمیں شامل ہیں۔ ہندوستان کے حصول آزادی کے بعد نیز برطانوی ہندوستان میں تعلیم کے صوبوں کو منتقل کئے جانے کے بعد تعلیمی پالیسی سے متعلق یہ پہلی قرارداد منظور ہوئی ہے۔ پچھلا ریزولیوشن ۱۹۱۳ء میں ہندوستان کی برطانوی حکومت نے منظور کیا تھا۔

پالیسی سے متعلق ریزولیوشن کی اہم خصوصیات یہ ہیں:۔

۱۔ آئین کے آرٹیکل ۴۵ کے مندرجات کے بموجب ۱۴ سال کی عمر تک مفت اور لازمی تعلیم دینے کی ذمہ داری پوری کرنے کے بھرپور کوشش کی جائے۔

۲۔ ٹیچروں کو جنہیں سماج میں عزت کا مقام حاصل ہے حیثیت اور تنخواہوں کا تسلی بخش تعین، ان کی استعداد اور ذمہ داریوں کی مطابقت سے کیا جائے۔

۳۔ تحقیق اور اس کی اشاعت کرنے اور قومی اور بین الاقوامی معاملات کے بارے میں تقریر و تحریر کے سلسلہ میں ٹیچروں کی تعلیمی آزادی کا تحفظ کیا جائے۔

۴۔ ہندوستانی زبانوں کو محنت سے ترقی دینا ہوگی اور ان کو یونیورسٹی کی سطح پر ذریعۂ تعلیم بنانے کی تدابیر اختیار کرنا چاہئیں گی (اس مقصد سے وقت کی کوئی قید ریزولیوشن میں نہیں رکھی گئی ہے)

۵۔ سکنڈری و ثانوی منزل پر سہ لسانی فارمولہ اختیار کیا جائے گا تاکہ ہندی بولنے والے علاقوں میں ہندی اور انگریزی کے ساتھ کسی جدید ہندوستانی زبان، جنوب کی کسی زبان کو ترجیح دی جائے گی اور غیر ہندی علاقوں میں ہندی اور انگریزی کے علاوہ علاقائی زبان کی پڑھائی ہوسکے۔

۶۔ ہندی کی ترقی کو بڑھاوا دینے کی پوری کوشش کی جائے گی۔

۷۔ ہندوستانی زبانوں کی نشوونما اور ہندوستان کے ثقافتی اتحاد میں سنسکرت کی مدد کے پیش نظر اس کے مطالعہ میں فراخدلی سے مدد دی جائے۔

۸۔ عالمی معلومات سے قدم ملا کر چلنے کے لئے انگریزی اور دیگر بین الاقوامی زبانوں کے مطالعہ پر خصوصیت سے زور دیا جانا چاہئے۔ (ریاست)

صفحہ ۱۲ سے آگے

اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مضمون "اردو آوازوں کی نئی درجہ بندی" اردو داں طبقہ کے لئے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالعلیم اور ڈاکٹر مختار الدین احمد کے مضامین بھی علمی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ چھ سو ستر صفحے کی اس دیدہ زیب کتاب کی قیمت تیس روپے موجودہ گرانی کے زمانے میں کسی طرح زیادہ نہیں کہی جاسکتی۔

دوسری کتاب انگریزی میں ہے۔ اس میں برنارڈ لیوس، منٹگمری واٹ، اے۔ جے۔ آربری۔ ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر این میری شمل۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف، آصف فیضی، ہمایوں کبیر، ڈاکٹر عبدالمعید خان، پروفیسر خلیق احمد نظامی، ڈاکٹر شبیر خان، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر مقبول احمد، ڈاکٹر گوپال سنگھ اور کچھ اور حضرات کے مضامین ہیں۔ دونوں کتابوں کے شروع میں ڈاکٹر تاراچند صدر مجلس نذر ذاکر کا تعارف ہے۔ افسوس ہے کہ اس کتاب میں طباعت کی کچھ غلطیاں بھی راہ پاگئی ہیں۔

اپنے محسنوں کی خدمات کا اعتراف کرنا، ان کے کارناموں کی اہمیت واضح کرنا اور ان کے چراغ سے لوگوں کے ذہن و دل میں بہت سے چراغ روشن کرنا ایک مبارک اور روح پرور کام ہے۔ اپنی ایک نظم میں اقبال نے اپنے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ ذاکر صاحب پر صادق آتا ہے۔

"ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ"

آل احمد سرور

میرا صفحہ

ڈاکٹر ذاکر حسین ہمارے صدر جمہوریہ ہی نہیں، ملک کے سب سے ممتاز ماہر تعلیم، قوم کے معمار، ایک صاحب طرز ادیب اور ہندوستان کی مشترک تہذیب کے ایک اعلیٰ ترین ہیں۔ وہ طالب علمی کے زمانے سے ہی اپنی ذہانت، تحریر و تقریر کی غیر معمولی صلاحیت اور اپنے ساتھیوں کی اعلیٰ مقاصد کے لئے قیادت کے لئے ممتاز تھے۔ جب گاندھی جی اور مولانا محمد علی نے علی گڑھ کے طالب علموں کو ترک موالات کا مشورہ دیا تو ذاکر حسین نے اپنے رفیقوں کے ساتھ علی گڑھ کے ایم اے او کالج کے سرکار پرست ماحول کو چھوڑ کر جامعہ کی آزاد فضا میں پناہ لی۔ وہاں سے وہ جرمنی گئے اور اقتصادیات میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرکے واپس آئے۔ اس وقت ترک موالات کے زمانے کا جوش سرد پڑ چکا تھا اور جامعہ کو چلانے میں دشواریاں محسوس ہو رہی تھیں۔ ذاکر صاحب نے اپنے رفیقوں ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر مجیب کے ساتھ ایک ایسی جماعت تیار کی جو جامعہ کی ساری ذمہ داری برائے نام معاوضہ پر لینے کو تیار تھے۔ اس کے بعد جامعہ کی بنیادیں مضبوط ہوئیں۔ اس کا بچوں کا اسکول اور پھر استادوں کا اسکول اپنی تعلیم اور تربیت کے لئے مشہور ہوا۔ ایک اردو اکاڈمی قائم ہوئی، رسالہ جامعہ نکلا، جامعہ قرول باغ کی کرائے کی عمارتوں کے بجائے اوکھلے کی کھلی فضا میں آئی۔ مشکل مقامات قدم قدم پر آئے۔ مالی دشواریوں نے برابر پریشان کیا مگر جامعہ ترقی کرتی گئی اور ہندوستان کا ایک ممتاز قومی ادارہ بن گئی جس کا مقصد شخصیت و سیرت کی تعمیر، ذہن کی بالیدگی، اخلاق کی استواری اور خدمت خلق کی لگن عطا کرنا تھا۔ ذاکر حسین نے گاندھی جی کے تعلیمی تصورات کی روشنی میں بنیادی تعلیم کا خاکہ بنایا جسے ملک اپنی ذہنی کاہلی اور ہوس کی گرم بازاری کی وجہ سے کامیابی سے نہ چلا سکا۔ جب ۱۹۴۷ء کے بعد ان کی مادر درسگاہ پر پھر برا وقت پڑا تو وہ علی گڑھ آگئے جہاں انھوں نے علم کا ماحول اور عمل کا ولولہ پیدا کیا۔ علی گڑھ کی امتیازی خصوصیات پر اصرار کرتے ہوئے انھوں نے ان کو قومی دھارے سے ہم آہنگ رکھا اور نئے ہندوستان کی تشکیل کی طرف علی گڑھ والوں کے ذہن کی باگ موڑ دی۔ آٹھ سال علی گڑھ کے وائس چانسلر رہنے کے بعد صحت کی خرابی کی بنا پر وہ یہاں سے الگ ہو گئے۔ انھیں عہدے کی ہوس کبھی نہ تھی۔ وہ نام و نمود کے پیچھے بھی کبھی نہ دوڑے۔ مگر ہمارے معمار اعظم جواہر لال نہرو ان کے جوہر کو پہچانتے تھے۔ انھوں نے پہلے انھیں بہار کا گورنر اور پھر ہندوستان کا نائب صدر بنایا۔ ان دونوں اہم عہدوں پر انھوں نے اپنی شرافت، اپنے اخلاق، اپنے تدبر اور سوجھ بوجھ کی وجہ سے لاکھوں کے دلوں کو موہ لیا۔ ذاکر صاحب اچھے کاموں میں دل کھول کر مدد کرتے ہیں، وہ کسی کی مخالفت نہیں کرتے، اپنے راستے پر چلتے رہتے ہیں۔ ان کا مطالعہ حیرت انگیز ہے۔ اقتصادیات و سیاسیات ہوں یا فلسفہ و ادب انھیں تمام اہم میلانات سے واقفیت ہے۔ وہ تقریر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ذہن سے پردے اٹھ رہے ہیں اور دل میں گرمی آرہی ہے۔ ان کی تحریروں میں حکمت و شعریت کا ایک انوکھا امتزاج ہے۔ ان کا افلاطون کا ترجمہ ریاست، اور ان کے تعلیمی خطبات اور بچوں کے لئے ان کی کہانیاں برابر ذوق و شوق سے پڑھی جائیں گی اور ذہن میں روشنی اور دل میں گداز پیدا کرتی رہیں گی۔ جب انھیں گذشتہ سال ہندوستان کی جمہوریت کا صدر بنایا گیا تو چند ایسے اشخاص کے سوا جن کے دلوں پر مہریں ہیں اور جن کے کان بند ہیں اور آنکھیں بے نور سبھی نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کے سچے جانشین اور نئے ہندوستان کے پہلے شہری کے انتخاب کے لئے ان سے زیادہ کوئی موزوں نہ تھا۔ ہماری جو کچھ ساکھ آج بیرونی ملکوں میں رہ گئی ہے وہ ہمارے سیاسی لیڈروں اور نیتاؤں کی وجہ سے نہیں ڈاکٹر ذاکر حسین، ونوبا بھاوے، جے پرکاش نرائن اور ہمارے چند گنے چنے دانش وروں، فنکاروں اور ادیبوں کی وجہ سے ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور ابھی اور لکھی جائیں گی لیکن ۷ر مئی ۱۹۶۸ء کو ایک سادہ سی تقریب میں، ان کی اکہتّرویں سالگرہ پر مجلس نذر ذاکر دہلی کی طرف سے ان کی خدمت میں جو دو کتابیں پیش کی گئیں، وہ ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ پہلی کتاب اردو میں ہے دوسری انگریزی میں۔ اردو میں جو کتاب ہے وہ اپنے مضامین کے علاوہ، کتابت و طباعت کے لحاظ سے بھی ایک خاص معیار رکھتی ہے جس پر مجلس نذر ذاکر مبارکباد کی مستحق ہے۔ اس سلسلے میں مضامین کی فراہمی اور کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں اردو کے مشہور عالم اور محقق جناب مالک رام نے جو تگ و دو کی اس کے لئے ہم سب کو ان کا ممنون ہونا چاہئے۔ اردو کی کتاب کے دو حصے ہیں۔ تذکرے کے عنوان سے ڈاکٹر تارا چند، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر مجیب اور ڈاکٹر یوسف حسین خان کے مضامین ہیں۔ ان میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مضمون خاصے کی چیز ہے اور ان کے اسلوب کا ایک دلکش نمونہ۔ یوسف صاحب نے ذاکر صاحب کے بزرگوں اور خاندان کے دوسرے اشخاص کے متعلق بہت مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ مجیب صاحب کے مضمون سے یہ اہم انکشاف ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب نے نہ صرف جامعہ کے پودے کو پروان چڑھایا، بلکہ اس کی بنیاد رکھنے کے لئے بھی قوی رہنماؤں خصوصاً حکیم اجمل خاں کو آمادہ کیا۔ مقالات کے ذیل میں اٹھارہ عالموں اور ماہرین فن کے مقالات ہیں جن کا جائزہ لینا اس صفحے پر ممکن نہیں۔ ان میں ڈاکٹر عابد حسین کا مضمون ہندوستانی روح کا بحران، پروفیسر مسعود حسن رضوی کا مضمون، شاہان اودھ کا علمی ذوق، مالک رام کا مضمون، گل رعنا غالب کا گم شدہ انتخاب، پروفیسر گیان چند کا مضمون اردو کی ہندی بحر

(باقی صفحہ ۱۱ کالم ۴ پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید بنیاد علی نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا